زیرِ نظر

اُستادِ محقّق آیت اللہ العظمیٰ ناصر مکارم شیرازی

تفسیرِ نمُونہ جلد ۲

ترجمہ

حضرت مولانا سید صفدر حُسین نجفی رحمہ اللہ

زیرِ سرپرستی

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الحاج سید علی رضا سیستانی مدظلہ

ترجمہ

۲۶۰۔ اور اس وقت (کو یاد کرو) جب ابراہیم نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ فرمایا: کیا تم ایمان نہیں لائے۔ کہنے لگے: کیوں نہیں میں چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان ہو جائے۔ فرمایا: یہ بات ہے تو چار پرندے انتخاب کرلو (ذبح کرنے کے بعد) انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرلو (پھر ان کے گوشت کو آپس میں ملادو) پھر ہر پہاڑ پر ایک حصّہ رکھ دو، پھر انہیں پکارو، وہ تیزی سے تمہارے پاس آئیں گے اور جان لو کہ خدا بے غالب اور حکیم ہے (وہ مردوں کے اجزائے بدن کو بھی جانتا ہے اور انہیں جمع کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے)۔

تفسیر

بہت سے مفسرین اور مورخین نے اس آیت کے ذیل میں یہ واقعہ لکھا ہے:

ایک دن حضرت ابراہیمؑ دریا کے کنارے سے گزر رہے تھے۔ آپ نے ایک مردار دریا کے کنارے پڑا ہوا دیکھا۔ اس کا کچھ حصّہ دریا کے اندر اور کچھ باہر تھا۔ دریا اور خشکی کے جانور دونوں طرف سے اسے کھا رہے تھے بلکہ کھاتے کھاتے ایک دوسرے سے لڑنے لگتے تھے۔ اس منظر نے حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسے مسئلے کی فکر میں ڈال دیا جس کی کیفیت سب تفصیل سے جاننا چاہتے ہیں اور وہ ہے موت کے بعد مردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت۔ ابراہیمؑ سوچنے لگے کہ اگر ایسا ہی انسانی جسم کے ساتھ ہو اور انسان کا بدن جانوروں کے بدن کا جزء بن جائے تو قیامت میں اٹھنے کا معاملہ کیسے عمل میں آئے گا جبکہ وہاں انسان کو اسی بدن کے ساتھ اٹھنا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے کہا: خدایا! مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر ایمان نہیں رکھتے۔ انہوں نے کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں دل کو تسلی ہو جائے۔

خدا تعالیٰ نے حکم دیا: چار پرندے لے لو اور ان کا گوشت ایک دوسرے سے ملادو۔ پھر اس سارے گوشت کے کئی حصے کر دو اور ہر حصّہ ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ اس کے بعد ان پرندوں کو پکارو تاکہ میدانِ حشر کا منظر دیکھ سکو۔ انہوں نے ایسا ہی کیا تو انتہائی حیرت کے ساتھ دیکھا کہ پرندوں کے اجزاء مختلف مقامات سے جمع ہو کر ان کے پاس آگئے ہیں اور ان کی ایک نئی زندگی کا آغاز ہو گیا ہے۔

اس مشہور واقعے کے مقابلے میں ایک مفسر ابومسلم نے ایک اور نظریہ پیش کیا ہے جسے مشہور مفسر فخر رازی نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ ابومسلم کا نظریہ باقی مفسرین کے برخلاف ہے لیکن چونکہ ایک معاصر مفسر مولف المنار نے اس کی تائید کی ہے، لہٰذا ہم اسے نقل کرتے ہیں۔

موصوف نے کہا ہے کہ آیت اس بات پر ہرگز دلالت نہیں کرتی کہ حضرت ابراہیمؑ نے پرندوں کو ذبح کیا اور پھر حکمِ خدا سے انہیں زندہ کیا۔ بلکہ آیت میں تو مسئلہ حشر و نشر واضح کرنے کے لیے ایک مثال پیش کی گئی ہے۔ یعنی اے ابراہیم! چار پرندے

لے لو اور انہیں اپنے ساتھ ایسے مانوس کر لو کہ جب انہیں پکارو تو وہ تمہارے پاس آجائیں اگرچہ ان میں سے ہر ایک کو ایک پہاڑ کی چوٹی پر بٹھا دو تو یہ کام تمہارے لیے کتنا آسان ہے۔ اسی طرح مردوں کو زندہ کرنا اور مختلف مقاماتِ عالم سے ان کے پراگندہ اجزار جمع کرنا بھی خدا کے لیے آسان ہے۔

اس لیے خدا نے ابراہیمؑ کو پرندوں کے بارے میں جو حکم دیا تھا وہ یہ نہ تھا کہ وہ ایسا کوئی کام کریں بلکہ صرف ایک مثال اور تشبیہ کے طور پر بیان کیا گیا تھا۔ یہ بعینہٖ ایسا ہے جیسے کوئی دوسرے سے کہے کہ میں فلاں کام نہایت آسانی سے اور تیزی سے کر سکتا ہوں۔ بس تم پانی کا ایک گھونٹ پیو اور میں یہ کام کیے دیتا ہوں۔ یعنی یہ میرے لیے اس قدر آسان ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسرے پر پانی کا گھونٹ پینا فرض ہو گیا ہے۔

دوسرے نظریے کے حامی "صرھن الیک" سے استدلال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جب یہ لفظ "الی" سے متعدی ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے "مائل کرنا" اور "مانوس بنانا" اس لیے جملے کا مفہوم ہوگا کہ مذکورہ پرندوں کو اپنے ساتھ مانوس کر و۔ علاوہ ازیں "صرھن" "منھن" اور "ادعھن" کی ضمیریں پرندوں کی طرف لوٹتی ہیں اور یہ اسی صورت میں صحیح ہے کہ ہم دوسری تفسیر کو درست مان لیں کیونکہ پہلی تفسیر کے مطابق بعض ضمیریں پرندوں سے متعلق ہیں اور بعض ان کے اجزاء سے متعلق جب کہ یہ مناسب دکھائی نہیں دیتا۔

ان استدلالات کا جواب ہم آیت کی تفسیر میں بیان کریں گے لیکن جس بات کی طرف یہاں اشارہ کرنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ آیت یہ حقیقت وضاحت سے پیش کرتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے حشر و نشر کے محسوس مشاہدے کا تقاضا کیا تھا تاکہ ان کا دل مطمئن ہو جائے اور واضح ہے کہ ایک مثال حشر و نشر کی منظر کشی نہیں کر سکتی اور نہ ہی دل کے لیے باعث اطمینان ہو سکتی ہے۔ درحقیقت عقل و منطق کے ذریعے تو حضرت ابراہیمؑ پہلے ہی حشر و نشر پر ایمان رکھتے تھے لیکن وہ چاہتے تھے کہ اس کا حسی طور پر مشاہدہ کر لیں۔

اب ہم آیت کی تفسیر کی طرف لوٹتے ہیں تاکہ واضح ہو جائے کہ کونسا نظریہ تفسیر سے میل کھاتا ہے۔

"واذ قال ابراھم رب ارنی کیف تحی الموتی":

جیسا کہ پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے کہ حشر و نشر کے بارے میں یہ آیت گذشتہ آیت کے موضوع کی تکمیل کرتی ہے۔

"ارنی کیف ....." سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مشاہدہ، رویت اور شہود کا تقاضا کر رہے تھے اور وہ بھی اصل معاد کا نہیں بلکہ اس کی کیفیت کا۔

"قال اولم تؤمن قال بلی ولکن لیطمئن قلبی":

ممکن تھا کہ مذکورہ مطالبے پر لوگ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کے بارے میں تنزلزل کا گمان کرتے لہٰذا انہیں وحی ہوئی: تو کیا تم ایمان نہیں لائے ہو؟ یہ اس لیے تھا تاکہ وضاحت ہو جائے اور اس واقعے سے کسی کو غلط فہمی نہ ہو لہٰذا انہوں نے کہا: جی ہاں، میرا ایمان تو ہے لیکن چاہتا ہوں دل مطمئن ہو جائے۔

ضمناً اس جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ مسئلے میں علمی اور منطقی دلائل سے یقین پیدا ہو جائے

لیکن اطمینان قلب نہ ہو کیونکہ استدلال عقلِ انسانی کو تو راضی کر لیتا ہے لیکن دل اور جذبات انسانی کو نہیں۔ جو دونوں کو سیراب کرتا ہے وہ شہود عینی اور "مشاہدات حسی" ہی ہیں۔ یہ ایک اہم بات ہے جس کے بارے میں اس کے مقام پر مزید وضاحت کریں گے۔

"قال فخذ اربعة من الطير فصرهن اليك ثم اجعل على كل جبل منهن جزءًا":

"صرهن" کا مادہ ہے "صور" (بروزن قول) اس کا معنی ہے "ٹکڑے کرنا" "مائل کرنا" اور "بلند آواز سے پکارنا"۔ یہاں پہلا معنی ہی مناسب ہے۔ یعنی چار پرندے انتخاب کرلو، انہیں ذبح کرو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کرکے ایک دوسرے سے ملا دو۔

مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ حشر و نشر اور مردوں کے اجزاء بدن کے بکھر جانے کے بعد زندہ ہونے کے نمونے کا مشاہدہ کریں اور یہ بات پکارنے اور مائل کرنے کے معانی سے حاصل نہیں ہوتی خصوصاً جبکہ آیت کا بعد کا حصّہ کہتا ہے: "پھر ہر پہاڑ پر ان میں سے ایک حصّہ رکھ دو" آیت کا یہ حصّہ واضح گواہی دے رہا ہے کہ پہلے پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا ہے اور ان کے اجزاء بنے ہیں۔ جو لوگ "صرهن" کا ترجمہ "مانوس اور مائل کرنا" کرتے ہیں وہ دراصل لفظ "جزء" کے معنی سے غافل ہیں۔

چند اہم نکات

۱۔ **چار پرندے:** اس میں شک نہیں کہ مذکورہ چار پرندے مختلف انواع میں سے تھے کیونکہ اس کے بغیر حضرت ابراہیمؑ کا مقصد پورا نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ ہر ایک کے اجزاء اس کے اصلی بدن میں واپس آئیں اور یہ مختلف انواع ہونے کی صورت میں ہی ظاہر ہو سکتا تھا۔ مشہور روایات کے مطابق وہ چار پرندے مور، مرغ، کبوتر اور کوّا تھے جو کہ کئی پہلوؤں سے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں۔

بعض ان پرندوں کو انسانوں کی مختلف صفات اور جذبات کا مظہر سمجھتے ہیں۔

مور: خود نمائی، زیبائش اور تکبر کا مظہر ہے،
مرغ: شدید جنسی میلانات کا مظہر ہے،
کبوتر: لہو و لعب اور کھیل کود کا مظہر ہے اور
کوّا: لمبی چوڑی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر ہے۔

۲۔ **پہاڑوں کی تعداد:** جن پہاڑوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پرندوں کے اجزاء رکھے تھے ان کی تعداد کی صراحت قرآن حکیم میں نہیں ہے لیکن روایات اہل بیتؑ میں یہ تعداد دس بتائی گئی ہے۔ اسی لیے بعض روایات میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص وصیت کر جائے کہ اس کے مال کا ایک جزء فلاں سلسلے میں صرف کرنا اور اس کی مقدار معین نہ کر جائے تو مال کا دسواں حصّہ دینا کافی ہے۔[1]

۳۔ **واقعہ کب رونما ہوا:** یہ واقعہ کب پیش آیا، جب حضرت ابراہیمؑ بابل میں تھے یا جب شام چلے آئے تھے۔ یوں

[1] تفسیر "نور الثقلین" جلد اوّل۔ صفحہ ۲۷۸

لگتا ہے کہ یہ شام میں آنے کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ سرزمین بابل میں پہاڑ نہیں ہیں ۔

"ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا" :

"پھر انہیں پکارو تو وہ تیزی سے تمہاری طرف آئیں گے" اس موقع پر ایک پرندے کے بکھرے ہوئے اجزاء جمع ہوئے اور آپس میں مل گئے اور پرندے نئے سرے سے زندہ ہو گئے ۔ البتہ ایسا ہونا بالکل خارقِ عادت اور خلافِ معمول ہے لیکن اگر ہم خدا کو طبیعی قوانین پر حاکم سمجھیں نہ کہ محکوم ، تو پھر مسئلے میں کوئی پیچیدگی نہیں رہے گی ۔

ضمناً یہ بھی ایک پہلو ہے کہ بعض نے لفظ "سعیًا" سے یہ سمجھا ہے کہ پرندے زندہ ہونے کے بعد پرواز نہ کر سکے بلکہ دوڑ کر ابراہیمؑ کے پاس آئے "سعیًا" ، عموماً لغتِ عرب میں تیزی سے چلنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔

خلیل بن احمد مشہور عربی ادیب سے منقول ہے کہ ابراہیمؑ چل رہے تھے کہ پرندے ان کے پاس آئے (یعنی "سعی" ابراہیمؑ سے متعلق ہے پرندوں سے نہیں) ۔

بہرحال اِن تمام باتوں کے باوجود کوئی مانع نہیں کہ "سعیًا" سریع اور تیز پرواز کے لیے کنایہ ہو ۔

"وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ" :

جب ابراہیمؑ یہ حیرت انگیز منظر دیکھ چکے تو انہیں وحی ہوئی کہ یہ واقعہ دیکھ کر جان لو کہ خدا ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کے تمام کام حکمت کے ماتحت ہیں اور لامتناہی علم و قدرت رکھنے کی وجہ سے اُس کے لیے مُردوں کے منتشر اجزاء کو جاننا اور انہیں جمع کرنا کوئی مشکل نہیں ۔

معادِ جسمانی

قیامت کے بارے میں قرآن مجید میں آنے والی بہت سی آیات معادِ جسمانی کی توضیح و تشریح کرتی ہیں ۔ اصولی طور پر جن لوگوں کا قرآن میں آیاتِ معاد سے رابطہ ہے وہ جانتے ہیں کہ قرآن میں معاد سے مراد معادِ جسمانی کے علاوہ اور کچھ نہیں اور معادِ جسمانی کا یہ مطلب ہے کہ حشر و نشر کے وقت یہ جسم بھی پلٹ آئے گا اور روح بھی ۔ اسی لیے تو قرآن میں اسے "احیاء الموتیٰ" (مردوں کو زندہ کرنا) کہا گیا ہے اور اگر قیامت صرف روحانی پہلو کی حامل ہوتی تو زندہ کرنے کا اصلاً کوئی مفہوم ہی نہ تھا ۔

زیرِ بحث آیت بھی صراحت سے اِسی بدن کے منتشر اجزاء کا لوٹنا بیان کر رہی ہے جس کا نمونہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ۔

شبہ آکل و مأکول

مُردوں کے زندہ ہونے کے منظر کا مشاہدہ کرنے کا تقاضا حضرت ابراہیمؑ نے جس وجہ سے کیا تھا اس کی تفصیل بیان ہو چکی ہے اور وہ تھا مردہ جانور کا دریا کے کنارے پڑا ہونے کا واقعہ جسے دریا اور خشکی کے جانور کھا رہے تھے ۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا تقاضا زیادہ تر یہ تھا کہ ایک جانور کا بدن دوسرے جانوروں کے بدن کا جزو بننے کے بعد اپنی اصلی صورت میں کیسے پلٹ سکتا ہے۔ علم عقائد میں اسی بحث کو "شبہٴ آکل و ماکول" کہا جاتا ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ قیامت میں خدا انسان کو اسی مادی جسم کے ساتھ پلٹائے گا۔ اصطلاحی الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ جسم اور روح دونوں پلٹ آئیں گے۔

اس صورت میں یہ اشکال سامنے آتا ہے کہ اگر ایک انسان کا بدن خاک ہو جائے اور درختوں کی جڑوں کے ذریعے کسی سبزی یا پھل کا جزو بن جائے پھر کوئی دوسرا انسان اسے کھائے اور اب یہ اس کے بدن کا جزو بن جائے یا مثال کے طور پر قحط سالی میں ایک انسان دوسرے انسان کا گوشت کھائے تو میدانِ حشر میں کھائے ہوئے اجزاء ان دونوں میں سے کس کے بدن کا جزو بنیں گے اگر پہلے بدن کا جزو بنیں تو دوسرا بدن ناقص اور دوسرے کا بنیں تو پہلا ناقص رہ جائے گا۔

اس کا جواب یہ ہے:

فلاسفہ اور علم عقائد کے علماء نے اس قدیم اعتراض کے مختلف جواب دیے ہیں۔ یہاں سب کے بارے میں گفتگو کرنا ضروری نہیں۔ بعض علماء ایسے بھی ہیں جو قابل اطمینان جواب نہیں دے سکے اس لیے انہیں معادِ جسمانی سے مربوط آیات کی توجیہ و تاویل کرنا پڑی اور انہوں نے انسان کی شخصیت کو روح اور روحانی صفات میں منحصر کر دیا۔ حالانکہ انسانی شخصیت صرف روح پر منحصر نہیں اور نہ ہی معاد جسمانی سے مربوط آیات ایسی ہیں کہ انکی تاویل کی جا سکے بلکہ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں وہ کاملاً صریح آیات ہیں۔

بعض لوگ ایک ایسی معاد کے بھی قائل ہیں جو ظاہراً جسمانی ہے لیکن معاد روحانی سے اس کا کوئی خاص فرق بھی نہیں۔

لیکن ہم یہاں قرآنی آیات کے حوالے سے ایک ایسا واضح راستہ اختیار کریں گے جو دورِ حاضر کے علوم کی نظر میں بھی صحیح ہے البتہ اس کی وضاحت کے لیے چند پہلوؤں پر غور کی ضرورت ہے۔

۱۔ ہم جانتے ہیں کہ انسانی بدن کے اجزاء بچپن سے لے کر موت تک بار بار بدلتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دماغ کے خلیے اگرچہ تعداد میں کم یا زیادہ نہیں ہوتے پھر بھی اجزاء کے لحاظ سے بدل جاتے ہیں کیونکہ ایک طرف سے وہ غذا حاصل کرتے ہیں اور دوسری طرف سے ان کی تحلیل ہوتی رہتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ ایک مکمل تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ دس سال سے کم عرصے میں انسانی بدن کے گذشتہ ذرات میں سے کچھ باقی نہیں رہ جاتا لیکن توجہ رہے کہ پہلے ذرات جب موت کی وادی کی طرف روانہ ہوتے ہیں اپنے تمام خواص اور آثار نئے اور تازہ خلیوں کے سپرد کر جاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انسانی جسم کی تمام خصوصیات رنگ، شکل اور قیافہ سے لے کر دیگر جسمانی کیفیات تک زمانہ گزرنے کے باوجود اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں اور اس کی وجہ یہی ہے کہ پرانی صفات نئے خلیوں میں منتقل ہو جاتی ہیں (غور کیجئے گا)۔

اس بناء پر ہر انسان کے بدن کے آخری اجزاء جو موت کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں وہ سب ان صفات کے حامل ہوتے ہیں جو اس نے پوری عمر میں کسب کئے ہیں اور یہ صفات انسانی جسم کی تمام عمر کی سرگذشت کی بولتی ہوئی تاریخ ہوتی ہیں۔

۲۔ یہ صحیح ہے کہ انسانی شخصیت کی بنیاد روح سے پڑتی ہے لیکن توجہ رہنا چاہیئے کہ روح کی پرورش جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور جسم کے ساتھ ہی روح تکامل وارتقا کی منزل حاصل کرتی ہے اور دونوں ایک دوسرے کے متقابل تاثیر رکھتے ہیں۔ اسی لیے جیسے دو جسم تمام جہات سے ایک دوسرے سے شباہت نہیں رکھتے، دو روحیں بھی تمام پہلوؤں سے ایک دوسرے سے مشابہ نہیں ہوتیں۔

اسی بناء پر کوئی روح اس جسم کے بغیر مکمل اور وسیع مشابہت اور کارکردگی باقی نہیں رکھ سکتی جس کے ساتھ اس نے پرورش پائی ہو اور تکامل وارتقاء حاصل کیا ہو لہٰذا ضروری ہے کہ قیامت میں وہی سابق جسم لوٹ آئے تاکہ اس سے وابستہ ہو کر روح عالی تر مرحلے میں نئے سرے سے اپنی فعالیت کا آغاز کرے اور اپنے انجام دیے ہوئے اعمال کے نتائج سے بہرہ مند ہو۔

۳۔ انسانی بدن کا ہر ذرہ اس کے تمام تشخصات جسمی کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی اگر واقعاً ہم بدن کے ہر خلیے (CELL) کی پرورش کر کے اُسے ایک مکمل انسان بنالیں تو وہ انسان اس شخص کی تمام صفات کا حامل ہوگا جس کا جزء لیا گیا تھا (یہ امر بھی قابلِ غور ہے)۔

پہلے دن انسان ایک خلیے سے زیادہ نہ تھا۔ پہلے نطفے کا خلیہ تھا۔ اسی میں انسان کی تمام صفات موجود تھیں۔ تدریجاً وُہ تقسیم ہوا اور دو خلیے بن گئے پھر دو سے چار ہوئے اور رفتہ رفتہ انسانی بدن کے تمام خلیے وجود میں آگئے۔ اسی بناء پر انسانی جسم کے تمام خلیے پہلے خلیے کی طرح ہیں اگر ان کی بھی پہلے خلیے کی طرح پرورش ہو تو ہر ایک ہر لحاظ سے ایک پورا انسان ہوگا جو بعینہٖ پہلے خلیے سے وجود میں آنے والے انسان کی سی صفات کا حامل ہوگا۔

اِن مندرجہ بالا تین مقدمات کو سامنے رکھتے ہوئے اب ہم اصل اعتراض کا جواب پیش کرتے ہیں۔

آیات قرآنی صراحت سے کہتی ہیں کہ آخری ذرات جو موت کے وقت انسانی بدن میں ہوتے ہیں، قیامت کے دن انسان انہی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔[1]

اِس بناء پر اگر کسی دوسرے انسان نے کسی کا گوشت کھایا ہو تو وہ اجزاء اُس کے بدن سے خارج ہو کر اصلی شخص کے بدن میں پلٹ آئیں گے۔ اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ پھر دوسرے کا بدن تو ضرور ناقص ہو جائے گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ناقص نہیں ہوگا بلکہ چھوٹا ہو جائے گا کیونکہ اِس کے اجزاء بدن سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں اب جب وہ اُس سے لے لیے جائیں گے تو اسی نسبت سے دوسرا بدن مجموعی طور پر لاغر اور چھوٹا ہو جائے گا مثلاً ایک انسان کا وزن ساٹھ کلو ہے۔ اس میں سے چالیس کلو دوسرے کے بدن کا حصہ تھا وہ لے لیا گیا تو باقی بیس کلو کا چھوٹا سا بدن رہ جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس طرح کوئی مشکل تو پیدا نہیں ہوگی۔ جواب یہ ہے کہ یقیناً نہیں ہوگی کیونکہ یہ چھوٹا سا بدن بلا کم و کاست دوسرے شخص کی تمام صفات کا حامل ہے۔ روزِ قیامت ایک چھوٹے بچے کی طرح اس کی پرورش ہوگی اور وہ بڑا ہو کر مکمل انسان کی شکل میں محشور ہوگا۔ حشر و نشر کے موقع پر ایسی پرورش و تکامل میں عقلی اور نقلی طور پر کوئی اشکال نہیں۔

یہ پرورش محشور ہوتے وقت فوری ہوگی یا تدریجی۔۔ یہ ہمارے سامنے واضح نہیں ہے لیکن ہم اتنا جانتے ہیں کہ جو صورت بھی ہو اس سے کوئی اعتراض پیدا نہیں ہو سکتا اور دونوں صورتوں میں مسئلہ حل شدہ ہے۔

---

[1] ان آیات کا مطالعہ کیجئے جن میں فرمایا گیا ہے کہ لوگ اپنی قبروں سے زندہ ہوں گے۔

ایک سوال اب یہاں باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ اگر کسی شخص کا سارا جسم دوسرے کے اجزاء سے تشکیل پایا ہو تو اس صورت میں کیا بنے گا۔

اس سوال کا جواب بھی واضح ہے کہ اصولی طور پر ایسا ہونا محال ہے کیونکہ مسئلہ آکل و مأکول کی بنیاد یہ ہے کہ ایک بدن پہلے موجود ہو اور وہ دوسرے بدن سے کھائے اور یوں پرورش پائے لہٰذا یہ ممکن ہی نہیں کہ کسی بدن کے تمام اجزا دوسرے بدن سے تشکیل پائیں ۔ پہلے ایک بدن فرض کرنا ہوگا جو دوسرے بدن کو کھائے اس طرح دوسرے بدن کا جز رہے گا نہ کہ کل (غور کیجئے گا)۔

ہم نے جو کچھ کہا ہے اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ایسے بدن سے معادِ جسمانی کے مسئلے پر کوئی اعتراض پیدا نہیں ہوتا اور جن آیات میں اس مفہوم کی صراحت کی گئی ہے، ان کی کسی توجیہ کی کوئی ضرورت نہیں ۔

۲۶۱۔ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ ۗ وَاللَّهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○

ترجمہ

۲۶۱۔ جو لوگ اپنا مال راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں وہ اس بیج کی مانند ہیں جس کے سات خوشے نکلیں اور ہر خوشے میں سو دانے ہوں اور خدا جس کے لیے چاہے (اور جو لیاقت و اہلیت رکھتا ہو) دوگنا یا کئی گنا کر دیتا ہے اور خدا (قدرت و رحمت کے لحاظ سے) وسیع اور (تمام چیزوں سے) آگاہ و دانا ہے ۔

تفسیر

انفاق ـــ طبقاتی تفاوت کا ایک حل

معاشرے کی ایک مشکل جس سے انسان ہمیشہ دوچار رہتا ہے اور باوجود اتنی صنعتی اور مادی ترقی کے انسان اس میں مبتلا ہے وہ طبقاتی تفاوت ہے ۔ ایک طرف فقر ، بے چارگی اور تنگدستی ہے اور دوسری طرف مال و دولت کے ڈھیر ہیں ۔

کچھ وہ لوگ ہیں کہ انہیں اپنی دولت کا اندازہ نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ فقر و فاقہ کی ایسی تکلیف دہ حالت سے دوچار ہیں کہ ضروریات زندگی مثلاً کھانا ، رہائش اور سادہ لباس بھی مہیا کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ۔